عادل شاہی دور

بہمنی سلطنت (۱۳۵۰ء-۱۵۲۵ء) پانچ صوبوں میں بٹ گئی۔ گول کنڈہ، بیجاپور، احمدنگر، بیدراور برید۔ گول کنڈہ میں قطب شاہی اور بیجاپور میں عادل شاہی حکومتیں قائم ہوئیں تھیں۔ یہ دونوں تہذیبی تمدنی اور سیاسی اعتبار سے دکن کی اہم ترین سلطنتیں گردانی جاتی تھیں۔ عادل شاہی سلطنت (۱۴۹۰ء-۱۶۸۵ء) کی بنیاد یوسف عادل شاہ نے ڈالی۔ یوسف عادل شاہ سلطنت عثمانیہ کا شہزادہ تھا جو اپنی جان بچا کر بھاگتا ہوا دکن آیا اور بہمنی سلطنت میں پناہ لی لیکن آہستہ آہستہ دکن میں اپنی ذہانت اور قابلیت سے بہمنی دور حکومت میں کئی اہم عہدوں پر فائز رہا یہاں تک کہ ۱۴۸۵ء میں صوبہ بیجاپور کا حاکم بنا دیا گیا۔ محمود شاہ بہمنی کے دور میں جب بہمنی حکومت کا زوال ہوا تو یوسف عادل شاہ نے اپنی خود مختار عادل شاہی سلطنت کا اعلان کیا۔

عادل شاہی بادشاہ فنون لطیفہ کے بڑے قدر دان تھے۔ چنانچہ ان کے دور حکومت میں مصوری، موسیقی، معماری، خطاطی، شاعری غرض ہر فن کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی گئی اور اِن تمام شعبوں میں جو کام انجام دئے گئے جو آج بھی نا قابل فراموش ہیں۔ بیجاپور کا شہر اپنی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کے اعتبار سے آج بھی دکن کا ایک اہم شہر ہے۔ یہ شہر اس زمانے میں فارسی اور دکنی شاعری کا ایک اہم مرکز تھا۔ بیجاپور کے تمام بادشاہ شعر و ادب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ ان میں اکثر بادشاہ فارسی اور دکنی کے اہم شاعر گزرے ہیں اور ان زبانوں کے شعراء کی سرپرستی کرتے تھے۔ اردو زبان ادب کے ارتقا کے سلسلے میں عادل شاہی بادشاہوں خاص کر علی عادل شاہ، ابراہیم عادل شاہ ثانی اور علی عادل شاہ ثانی کے نام ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عادل شاہی حکومت کا ابتدائی دور اردو زبان و ادب کے ارتقا کے سلسلے میں زیادہ سازگار ثابت نہ ہو سکا کیونکہ یوسف عادل شاہ بانی عادل شاہی سلطنت ترکی نژاد تھا اور اس کی پرورش ایران میں ہوئی تھی۔ اس لئے فارسی زبان کے ساتھ قدرتی دلچسپی کے باعث انھوں نے اردو کے بجائے فارسی کو دفتری زبان قرار دیا لیکن دکنی شعراء کی برابر سرپرستی کرتے رہے۔ یوسف عادل شاہ خود فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ان کے بیٹے اسماعیل عادل شاہ نے بھی فارسی کو ہی سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اس وجہ سے اس ابتدائی دور میں اردو کی ترقی سرکاری سطح پر رُک گئی لیکن رابطے کی زبان کے طور پر اردو برابر اپنا کام انجام دیتی رہی اور دکن کی دوسری سلطنتوں میں اردو کو برابر سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ حاصل رہا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو جب تخت نشین ہوا تو انھوں نے اردو زبان کی ترقی اور ترویج میں گہری دل چسپی کا مظاہرہ کیا اور اردو کو تہذیبی اور سیاسی سطح پر مستحکم کرنے کی کوششیں کیں۔ ان کی کتاب نورس اور علی عادل شاہ ثانی کی کلیات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اردو ان کے عہد میں کس قدر مقبول تھی اور اس میں ادبی اعتبار سے کتنی پختگی آ چکی تھی۔ اس دور سے تعلق رکھنے والے اہم شاعروں میں اشرف، میراں جی، شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، ابراہیم عادل شاہ ثانی، عبدل، مقیمی، ملک خوشنود، رستمی، حسن شوقی، امین الدین اعلیٰ، ہاشمی، نصرتی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کی ابتداء اور ابتدائینشو ونما شمالی ہندوستان کے دِلی اور اس کے آس

پاس والے علاقوں میں فارسی کے زیرِ اثر ہوئی لیکن اردو شمالی ہندوستان میں تقریباً چار صدیوں تک محض بول چال کی زبان کے طور پر مستعمل رہی۔ فارسی نے اس کو ایک ادبی زبان کے طور پر پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ اس وجہ سے ان چار صدیوں میں کوئی ادبی کام اس زبان میں نہیں ملتا سوائے امیر خسرو کے ہندی کلام اور چند ایک اور انفرادی کوششوں کی۔ لیکن اس کے بجائے دکن میں اس زبان کو بہت ہی سازگار ماحول میّسر ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہاں شمالی ہندوستان سے بہت پہلے اردو زبان کو ادبی زبان کے طور پر استعمال کیا گیا اور شعراء نے اس کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا وسیلہ بنایا۔

اشرف ایک مثنوی ''نوسرہار'' کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ دکنی اردو کی ایک قدیم مثنوی ہے۔ جو واقعۂ کربلا پر لکھی گئی ہے۔ مثنوی میں واقعۂ کربلا اور شہادت امام حسین علیہ السلام بنیادی موضوع ہے۔ لیکن اس میں واقعے کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے وہ تاریخی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ مثنوی نو ابواب پر مشتمل ہے اس وجہ سے اس کا نام ''نوسرہار'' رکھا گیا ہے۔ ادبی لحاظ سے یہ کوئی اہم مثنوی نہیں ہے لیکن اس کی لسانی اور تاریخی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ نوسرہار کی زبان اور اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روضۃ الشہداء کی طرح مجلسوں میں سنانے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس وجہ سے اس میں بول چال کی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ نوسرہار کی زبان اُس دور کی اردو زبان کا بہترین نمونہ ہے۔

صوفیائے کرام نے اردو کی نشو ونما میں جو کام انجام دیا ہے۔ اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اردو زبان کی ابتدائی تصنیفات متصوّفانہ خیالات پر ہی مبنی ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان وادب کا ارتقا صوفیائے کرام کا مرہون منت ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ شاہ میراں جی شمس العشاق دکن کے صوفی شعراء میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے بیجاپور میں ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جن میں ان کے جانشین یکے بعد دیگرے کئی پشتوں تک بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق رہے ہیں۔ شاہ میراں جی نے متعدد عارفانہ رسائل تصنیف کیے ہیں۔ ''خوش نامہ''، خوش لغز، شہادت الحقیقت ان کی منظوم مختصر مثنویاں ہیں۔ ان منظوم رسالوں کے علاوہ ان کے کئی رسالے نثر میں بھی ہیں ان میں گل باس، اور جل ترنگ کے نام خاص طور پر قابل ذِکر ہیں۔ ان کی مثنویوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ لیکن چوں کہ ان کا مقصد عوام کی رشد وہدایت تھی اور یہ مثنویاں عوام کے لئے لکھی گئی ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری منظوم نثر ہو کر رہ گئی ہے۔ برہان الدین جانم میراں جی کے فرزند تھے۔ برہان الدین جانم بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں ارشاد نامہ، حجت البقا، بشارت الذکر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ارشاد نامہ ان کی ایک طویل نظم ہے۔ اس کی صورت سوال وجواب کی ہے۔ طالب سوال کرتا ہے اور مرشد اس کا جواب دیتا ہے۔ اس میں صوفیائے کرام کے عام موضوعات مثلاً ذات وصفات، جبر ونذر، دوزخ وبہشت، دیدار الٰہی وغیرہ کی تفصیل ملتی ہے۔ ان کے نظموں کی بحر ہندی ہے۔ وہ عروض اور نظم کے اصولوں کی چنداں پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں ہندو مسلم یگانگت کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ چونکہ دونوں صوفیائے کرام عوام سے مخاطب تھے اس لیے دونوں کے کلام میں عوامی رجحان نمایاں ہے۔ برہان الدین جانم نے نظموں کے علاوہ گیت اور دوہرے بھی لکھے ہیں لیکن ان پر گجری کی روایت غالب نظر آتی ہے۔

عادل شاہی خاندان کا چھٹا فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی ہے۔ جس نے صرف نو سال کی عمر میں اپنے چچا علی عادل شاہ

سے تخت حاصل کیا اور ۱۵۸۰ء سے ۱۶۲۷ء تک بڑی شان سے حکومت کی۔ وہ فنون لطیفہ کا بڑا دلدادہ تھا۔ ان کے عہد میں شہرِ بیجاپور علم و ادب اور موسیقی کا ایک بڑا مرکز ہو گیا تھا۔ مورخین نے اس کے دورِ حکومت کو ہر لحاظ سے سراہا ہے۔ شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ لیکن اُس سے زیادہ لگاؤ فن موسیقی کے ساتھ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک شہر نورس پور بسایا تھا۔ جہاں صرف موسیقار رہتے تھے اور جہاں باضابطہ موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ موسیقاروں کے کئی طبقے بنائے گئے تھے۔ ادنیٰ درجے کا گنی جن اور اعلیٰ مرتبہ کا عطائی کہلاتا تھا۔ ان کی طبیعت شاعرانہ تھی۔ چنانچہ فارسی اور دکنی دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ دکنی میں اُن کی ایک کتاب ''نورس'' یادگار ہے۔ نورس موسیقی پر ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ اس میں ابراہیم جگت گرو نے مخصوص راگ راگنیوں کے تحت الگ الگ گیت ترتیب دیے ہیں۔ اس میں سترہ راگوں کے تحت ۵۹ گیت اور سترہ دوہرے لکھے گئے ہیں اور ہر گیت سے پہلے راگ کا نام دیا گیا ہے۔ ہر گیت موضوع کے اعتبار سے مختلف ہے۔ ان گیتوں کے بغور مطالعے سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی پوری شخصیت سامنے آتی ہے۔ ان کے عقائد، خیالات، خواہشات ان گیتوں سے صاف طور پر نظر آتے ہیں۔

کتاب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نہ صرف دکنی بلکہ سنسکرت اور برج بھاشا اور سب سے بڑھ کر ہندو اساطیر اور دیومالا پر پورا پورا عبور تھا۔ کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فارسی عروض کے بجائے ہندی عروض کا استعمال کیا گیا ہے اور اس میں فارسی عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے الفاظ و مرکبات کثرت سے استعمال ہوئے۔ نورس کا لفظ ابراہیم کو عزیز تھا اسی لئے اُس نے اپنے محل، اپنے شہر، اپنی کتاب، اپنے ہاتھی اور اپنے سکوں کے ساتھ نورس کا لفظ لگایا ہے۔ نورس موسیقی اور تاریخ و لسانیاتی اعتبار سے ایک اہم کتاب ہے۔

عبدل ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کا ایک اہم شاعر گزرا ہے۔ اس کی کتاب ''ابراہیم نامہ'' دبستان بیجاپور کا پہلا مکمل ادبی نقش ہے۔ عبدل دہلوی ابراہیم عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھا۔ ''ابراہیم نامہ'' ایک طرح کا شاہنامہ ہے جس میں عبدل نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ کی مجلسی اور معاشرتی زندگی قلم بند کی ہے۔ ابراہیم نامہ دراصل قصیدہ ہے جو مثنوی کی بیت میں لکھا گیا ہے۔ ابراہیم نامہ میں عبدل اپنے ممدوح کو شہ ابراہیم، شاہِ استاد، شاہ نورس، عالم پناہ، جگت گرو، وغیرہ القاب سے یاد کرتا ہے۔ ابراہیم نامہ کی چند داخلی شہادتوں کے سوا عبدل کے بارے میں کسی قسم کی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ عبدل نے ابراہیم نامہ میں اپنے دہلوی ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور اپنی زبان کو ہندوی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

زبان ہندوی مجھ سو ہوں دہلوی　　نہ جانوں عرب ہور عجم مثنوی

ابراہیم نامہ میں عربی فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عبدل کو عربی فارسی پر مکمل عبور تھا لیکن دکنی اردو سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ اس لیے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار دکنی میں ہی کرنا چاہتے تھے ورنہ وہ ابراہیم نامہ فارسی میں بھی تحریر کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے دہلوی ہونے پر بھی فخر تھا۔ دکنی اردو میں بہت سی مثنویاں لکھی گئی ہیں البتہ ایسی مثنویوں کی تعداد بہت کم ہے جو کسی مخصوص دور کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی حالات کی عکاسی کرتی ہو۔ عبدل نے ابراہیم نامہ میں اس دور کے معاشرتی، تاریخی اور سیاسی حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ اس عہد کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ اس طرح ادبی

ولسانی اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ تاریخی لحاظ سے بھی ایک کامیاب مثنوی ہے۔ابراہیم نامہ محض ایک توصیف نامہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے ابراہیم کی مکمل شخصیت سامنے آتی ہے۔اس میں ابراہیم کی زندگی اور سیرت کا تذکرہ جس انداز سے ہوا ہے وہ محض قصیدہ خوانی کے طور پر نہیں ہوا بلکہ اس کی تاریخی شہادتیں بھی ہیں۔اردو شاعری میں واقع نگاری کی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں لیکن عبدل اپنی مثنوی میں جہاں جہاں واقعہ نگاری کی طرف مائل ہوئے ہیں وہاں واقعہ نگاری کے بے مثال نمونے پیش کیے ہیں ابراہیم نامہ کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندووں کی اور ہندی کی تشبیہات کا بڑی آزادی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔علم وادب کی روایت جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور میں پروان چڑھ رہی تھی وہ سلطان محمد عادل شاہ کے دور میں ترقی کی نئی منزلوں کو چھونے لگی۔عادل شاہی دور کے کئی اہم ترین شاعر، مقیمی، صنعتی، رستمی، ملک خوشنود، حسن وشوخی اور امین الدین اعلیٰ اسی بادشاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔اس دور کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ فارسی اسلوب اور فارسی روایات کا اثر دکنی اردو کے ادبی سرمائے پر تیزی سے غالب ہونے لگا۔ہندی روایات اور الفاظ کا استعمال آہستہ آہستہ کم ہونے لگا لیکن تخلیقی اعتبار سے شاعروں میں پختگی کے آثار نمایاں ہیں۔

مقیمی کی مثنوی ''چندر بدن مہیار'' دکنی ادب میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔اس میں دکن کی ایک لازوال عشقیہ داستان کو منظوم پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔''چندر بدن ومہیار'' دکن کے لیلا مجنون ہیں اور مقیمی نے ان کے عشق کی کہانی کو بڑے مؤثر ڈھنگ میں پیش کیا ہے۔

رستمی عادل شاہی دور کا ایک باکمال شاعر تھا۔قصائد اور غزلیات کے علاوہ ان کی ضخیم مثنوی ''خاور نامہ'' ہے۔صنعتی کے بارے میں بھی مکمل حالات دستیاب نہیں ہیں البتہ اتنا معلوم ہو چکا ہے کہ وہ محمد عادل شاہ کے دور کا شاعر ہے۔اپنی مثنوی ''قصہ بے نظیر'' میں انھوں نے سلطان محمد عادل شاہ کی مدّح میں ایک باب تحریر کیا ہے۔اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کے دربار سے وابستہ تھا اور اسی دور سے تعلق رکھتا تھا۔

حسن شوقی ایک مثنوی نگار اور غزل گو کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ان کی دو مثنویاں ''فتح نامہ نظام شاہ'' اور ''میز بانی نامہ'' ہیں۔''فتح نامہ نظام شاہ'' کی دکن کی مشہور جنگ تالیکوٹ پر لکھی گئی ہے۔جس میں حسن شوقی نے اپنے مربی نظام شاہ کو فاتح قرار دیا ہے اور ''میز بانی نامہ'' نواب مظفر خان کی لڑکی سے سلطان محمد عادل شاہ کی شادی کے موقع پر لکھی گئی ہے۔دونوں مثنویاں تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور اسلوب بیان کے اعتبار سے دکنی اردو میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی غزلیات اپنے مزاج کے اعتبار سے فارسی غزلوں کی پیروی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔زبان کی ناہمواری اور کھردُرے پن کے باوجود ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی مٹھاس اور شرینی نظر آتی ہے۔ان کی غزلوں کا بنیادی موضوع حسن وعشق کی کیفیات ہیں۔بقولِ جمیل جالبی ان کی غزلوں میں جسم کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔